رسائل و مسائل

حضورؐ کی تاریخِ وفات و ولادت

سوال:۔ میرے دل میں سخت پریشانی ہے کہ فرقۂ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ سرکارِ رسالت مآبؐ کی وفات و ولادت ۱۲؍ ربیع الاوّل ہے، اور فرقۂ شیعہ کا خیال ہے کہ حضورؐ کی پیدائش ۱۷؍ ربیع الاوّل اور وفات ۲۸؍ صفر ہے۔ حضورؐ کی وفات کے وقت اہل بیتؓ و صحابہ کرامؓ دونوں موجود تھے۔ اختلاف کیوں ہوا اور کب ہوا؟ اصحابِ محمدؐ و اہل بیتِ محمدؐ کے زمانے میں اُن کا کیا عمل تھا؟ طبیعت پریشان ہے۔

جواب:۔ اہلِ سنّت کی روایات میں اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور وفات ربیع الاوّل میں پیر کے روز ہوئی تھی۔ البتہ تاریخوں میں اختلاف ہے۔ ولادتِ مبارکہ کے بارے میں کسی نے ۲، کسی نے ۸، کسی نے ۱۲، اور کسی نے ۱۷ تاریخ لکھی ہے، لیکن جمہور اہلِ سنّت کے ہاں مشہور تاریخ ۱۲ ربیع الاوّل ہے۔ اسی طرح وفات کے بارے میں کسی نے یکم ربیع الاوّل، کسی نے ۲، اور کسی نے ۱۰ تاریخ لکھی ہے، مگر جمہور اہلِ سنت میں مشہور تاریخ ۱۲ ربیع الاوّل ہی ہے۔ اہلِ سنّت کی روایات کے مطابق حضورؐ کی وفات اور ولادت کے بارے میں صحابۂ کرام اور اہل بیت کے ہاں نہ کوئی عمل رائج تھا نہ کسی قسم کی تقریبات ہوتی تھیں۔

اہلِ تشیّع کی مشہور کتاب علامہ کلینی کی اصولِ کافی میں بھی تاریخ پیدائش و وفات دونوں ۱۲ ربیع الاوّل ہی درج ہیں۔ لیکن علمائے شیعہ کا اتفاق اس پر ہے کہ تاریخ ولادت ۱۷ ربیع الاوّل اور تاریخ وفات ۲۸ صفر ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، ائمۂ اہل بیت بھی حضورؐ کی ولادت یا وفات کے دن کوئی تقریب منعقد نہیں کرتے تھے۔

یہ تعین کرنا بہت مشکل ہے کہ تاریخوں میں اختلاف کیوں ہوا اور کب ہوا؟

کیا فقہی مسلکوں کے لیے "مذاہب" کا لفظ صحیح ہے؟

سوال:۔ جنوری کے ترجمان القرآن میں آپ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حنفی فرقہ یا شافعی فرقہ کے لیے حنفی مذہب یا شافعی مذہب کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میرا مذہبی علم ایک عام مسلمان کا سا ہے جو مذہب کو ان فرقہ بندیوں سے کچھ اُوپر تصور کرتے ہیں۔ کیا ہم سب فرقوں کا مذہب ایک نہیں ہے؟

جواب:۔ عربی زبان میں لفظ مذہب کے معنی وہ نہیں ہیں جو اُردو زبان میں ہیں۔ اُردو زبان میں یہ لفظ "دین" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ لیکن عربی میں یہ SCHOOL OF THOUGHT کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنفی وغیرہ فرقے نہیں ہیں بلکہ دینِ اسلام کے اندر مسلّمہ مذاہب ہیں۔ ان کے لیے اصطلاحی لفظ مذہب ہی ہے۔ کسی زمانے میں بھی اہلِ علم نے انہیں فرقہ نہیں قرار دیا ہے۔

عُشر و زکوٰۃ اور سرکاری ٹیکسوں میں فرق

سوال:۔ شرعی مسئلہ حل کرنے کے لیے جناب کی رائے مبارک کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ ایامِ حال میں ایک مجمع میں عام بحث میں عُشر اور زکوٰۃ کا مسئلہ زیرِ بحث آ گیا۔ ایک صاحب نے جو عالمِ دین نہیں ہیں، لیکن مطالعہ بہت زیادہ کیا ہے، جج بھی رہ چکے ہیں، فرمایا کہ عُشر دسویں حصّہ پیداوار اراضی پر عائد ہوتا ہے، اور زکوٰۃ جمع شدہ دولت کا صرف چالیسواں حصّہ ہے۔ لیکن مالیہ اور آبیانہ اراضی کی پیداوار کے نصف پر تشخیص ہوتا ہے۔ زرعی ٹیکس اس کے علاوہ ہے، اور جمع شدہ دولت پر انکم ٹیکس ایک بھاری شرح سے لگایا جاتا ہے۔ یہ سب مالیہ، آبیانہ، زرعی ٹیکس، انکم ٹیکس اور ایک جائداد ٹیکس وصول ہو کر بیت المالِ حکومت میں داخل ہو کر رفاہِ عام یعنی راہ، مدرسے، ہسپتال اور ہمچو قسم ضروریاتِ عالم پر خرچ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے عشر اور زکوٰۃ کا دینا اب لازم نہیں آتا۔ میرا اس رائے سے اتفاق نہیں تھا اور اپنی یہ رائے پیش کی کہ اوّل تو تحصیل اور انکم ٹیکس

کے دفاتر بیت المال کی تعریف ہی میں نہیں آتے۔ دوسرے ان رقومات وصول شدہ کا مصرف حکم قرآنی کے مطابق نہیں ہوتا۔ آپ بتائیں کہ میری رائے صحیح ہے یا جج صاحب کی؟

جواب:۔ (از ملک غلام علی صاحب) زکوٰۃ کے متعلق پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ یہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور رکن اسلام ہے، جس طرح نماز روزہ اور حج ارکان اسلام ہیں۔ جس شخص نے بھی کبھی قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ قرآن بالعموم نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے اور اسے اُس دین کا ایک رکن قرار دیتا ہے جو ہر زمانے میں انبیائے کرام کا دین رہا ہے۔ اس لیے اس کو ٹیکس سمجھنا اور ٹیکس کی طرح اس سے معاملہ کرنا پہلی بنیادی غلطی ہے۔ ایک اسلامی حکومت جس طرح اپنے ملازموں سے دفتری کام اور دوسری خدمات لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب نماز کی ضرورت باقی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے سرکاری ڈیوٹی دے دی ہے، اسی طرح وہ لوگوں سے ٹیکس لے کر نہیں کہہ سکتی کہ اب زکوٰۃ کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ ٹیکس لے لیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت کو اپنے نظام الاوقات لازماً اس طرح مقرر کرنے ہوں گے تاکہ اس کے ملازمین نماز وقت پر ادا کر سکیں۔ اسی طرح اس کو اپنے ٹیکسوں کے نظام میں زکوٰۃ کی جگہ نکالنے کے لیے مناسب ترمیمات کرنی ہوں گی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ حکومت کے موجودہ ٹیکسوں میں کوئی ٹیکس اُن مقاصد کے لیے اس طرح استعمال نہیں ہوتا جن کے لیے قرآن میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اور جس طرح اس کی تقسیم کرنے کا حکم ہے۔

اسلام میں جمہوریت کی اصل حیثیت

سوال:۔ میں امریکہ کی یوٹاہ اسٹیٹ یونیورسٹی میں ہوں۔ یہاں بہت دنوں سے کچھ ایسے تبصرے ہو رہے ہیں جن کا جواب دینے کے لیے میرا علم ناکافی ہے، اس لیے آپ سے رہنمائی کی درخواست کر رہا ہوں۔ سب سے پہلی بات جو عام طور سے یہاں مسلمان صاحبان کہتے ہیں یہ ہے کہ جمہوریت اوّل تو سرے سے اسلام میں تھی ہی نہیں، اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ لوگوں کی رائے سے حضرت علیؓ نے

بھی اکثریت کا فیصلہ تسلیم کر لیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کا فیصلہ سب کے لیے قابلِ قبول ہونا چاہیے۔ پھر کیوں لوگ مسٹر بھٹو کو حاکمِ وقت مانتے ہوئے اُن کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتے؟ اگرچہ وہی صاحبان یہ بات مانتے ہیں کہ حاکمِ وقت کے فیصلے غلط بھی ہوتے ہیں۔

ایک اور واقعہ کو ایک صاحب نے بہت اچھال رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ابوسفیان جب مسلمان ہوئے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اچھے مسلمان ہیں۔ حالانکہ ابوسفیان نے ان کے قول کے مطابق حضورؐ کے بعد یہ کہا کہ اب تو خلافت بھی ہاشمی خاندان میں بٹنے لگی۔ کیا ان کی یہ بات صحیح ہے؟

جواب: (از ملک غلام علی صاحب) آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اگرچہ آپ میں دینی معلومات کی کمی ہے مگر آپ دینی جذبات و عزائم سے خالی نہیں ہیں اور جو بات آپ کو معلوم نہیں آپ نے اس کا علم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے سوالات کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں:-

۱- یہ بات غلط ہے کہ جمہوریت اسلام میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں) ظاہر ہے کہ خلافت و امارت، جو مسلمانوں کا اہم ترین معاملہ ہے اس پر بھی یہی اصول لاگو ہوگا کہ خلیفہ مسلمانوں کی رائے عام کے مطابق منتخب ہو اور مشورے سے حکومت کرے۔ لیکن عام رائج الوقت جمہوریت اور اسلام کی جمہوریت میں یہ فرق ہے کہ مغربی جمہوریت میں تو باشندوں کی مجرد اکثریت ہر شے کو جائز و ناجائز اور واجب و ممنوع قرار دے سکتی ہے۔ مگر اسلام میں مسلمانوں کی اکثریت خدا اور رسولؐ کے حرام کردہ امور کو حلال اور حلال کردہ اُمور کو حرام نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی اکثریت اگر چاہے بھی تو وہ کسی قادیانی، کسی عیسائی بلکہ کسی فاسق و فاجر کو بھی اپنا امیر نہیں بنا سکتی۔ اگر بنا لے تو اسلام کی نظر میں یہ امارت جائز نہ ہوگی۔ اسی طرح مسلمان اگر سارے مل کر بھی یہ چاہیں کہ زنا یا شراب کو حلال کر دیں تو ان کا فیصلہ کالعدم ہوگا۔ مسلمانوں کے منتخب شدہ امیر کی اطاعت بھی مشروط ہے۔ اگر وہ کوئی حکم خلاف شریعت دے یا اسلام کے خلاف کوئی قانون بنائے تو مسلمانوں پر اُس کی اطاعت واجب نہیں۔ لیکن مسلمان خلیفہ میں اگر اسلامی صفات موجود ہوں اور اس کا حکم خلافِ شریعت نہ ہو تو اس کی نافرمانی جائز نہ ہوگی۔

۲- حضرت ابوسفیان کی طرف جو بات ان لوگوں نے منسوب کی ہے وہ خلافِ واقعہ ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ ہونے پر ابوسفیان نے حضرت علیؓ کو ان کی مخالفت پر اُکسایا اور کہا کہ آپ اُٹھیں تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے سختی سے حضرت ابوسفیان کو جواب دیا کہ تم پہلے اسلام اور اہلِ اسلام کی مخالفت کرتے رہے اور کچھ نہ بگاڑ سکے۔ خدا کی قسم میں حضرت ابوبکرؓ کو خلافت کا اہل سمجھتا ہوں، اور پھر حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان بنی ہاشم کی خلافت پر معترض ہونے کے بجائے اس کے لیے خود کوشش کرنا چاہتے تھے۔

بلوچستان میں منگنی کی رسم

سوال:- سارے بلوچستان میں منگنی کی رسم قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے اور منگنی میں تمام شرعی ایجاب و قبول اور خطبۂ نکاح اکثر موقع پر ہوتا ہے۔ البتہ منگنی کو تمام بلوچستان میں بلکہ بشمول افغانستان ایک نکاح تصور کیا جارہا ہے۔ منگنی کے بعد یہاں دستور ہے کہ سوائے خوراک کے عورت کی تمام دیگر ضروریات منگیتر یعنی مرد مہیا کرتا ہے مگر ایک دوسرے سے پردہ بھی کرتے ہیں اور جب تک شادی نہیں ہوتی پردہ جاری رہتا ہے۔ اب چند عرصہ سے مولوی صاحبان اس منگنی کو، جس میں ایجاب و قبول بھی ہوا صرف ایک وعدہ تصور کرتے ہیں اور فتاوٰے دارالعلوم دیوبند میں بھی متعدد مقامات پر اس منگنی کو صرف ایک وعدہ قرار دیا گیا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ شادی کے موقع پر بھی خطبۂ نکاح پڑھا جاتا ہے اور ایجاب و قبول ہوتا ہے، اس لیے منگنی کے دن جو ایجاب و قبول اور خطبہ ہوتا ہے وہ صرف وعدہ ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ بلوچستان ایک قبائلی علاقہ ہے یہاں اگر ایک لڑکی کا والد یا بھائی منگنی کو صرف ایک وعدہ تصور کرے اور لڑکی اس منگیتر کو نہ دے اور کسی اور جگہ شادی کر دے تو سخت جھگڑا ہوتا ہے بلکہ معاملہ قتل و مقاتلہ تک پہنچ جاتا ہے۔ سارے بلوچستان میں یہ ایک بے چینی اور بے اطمینانی کا سبب بن گیا ہے۔ قبائلی تنازعات چونکہ روزمرّہ پیدا ہوتے ہیں اور ہمیشہ اکثر چھوٹے چھوٹے معاملات پر برپا ہوتے رہتے ہیں اس وجہ سے سال میں کئی منگنیاں توڑ دی جاتی ہیں اور فتنہ و فساد کی ایک آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ دوسرے علاقوں میں منگنی کے طریقے کا

ہمیں علم نہیں۔ یہاں کی منگنی پر باقاعدہ دعوت ہوتی ہے۔ سو پچاس یا کم و بیش آدمی مرد کے ساتھ جاتے ہیں۔ لڑکی کا والد ضیافت کرتا ہے یا صرف شیرینی تقسیم کرتا ہے۔ پھر امام باقاعدہ خطبہ پڑھ کر ایجاب و قبول کراتا ہے۔ اب علمائے ان تمام چیزوں کو صرف وعدہ قرار دے دیا ہے اور دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی اسی طرح ہے۔ لیکن عوام اس سے بے خبر ہیں کہ منگنی صرف ایک وعدہ ہے۔ اگر عوام کو اس کا علم ہو جائے تو قبائلی اختلافات کی وجہ سے کئی کئی منگنیاں منسوخ کر دی جائیں اور ایک بڑے فتنہ کا امکان ہے۔

یہ امر واقعی ہے کہ اس وقت نہیں بلکہ قدیم زمانے سے منگنی کے روز بھی ایجاب و قبول ہوتا ہے اور پھر شادی کے روز پھر ایجاب و قبول ہوتا ہے یعنی دو مرتبہ ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ منگنی کے بعد اگر زوجین میں افتراق ہو تو منگیتر باقاعدہ طلاق دیتا ہے۔

جواب:۔ (از ملک غلام علی صاحب) آپ نے بلوچستان میں منگنی کی رسم کے متعلق جو تفصیلات لکھی ہیں وہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکیں۔ تاہم جو ایجاب و قبول رکن نکاح ہے اور جس سے نکاح منعقد ہوتا ہے۔ اس کی ضروری تفصیل درج ذیل ہے:۔

ایجاب و قبول کے لیے ضروری ہے کہ فریقین عاقدین خود بالغ ہوں تو وہ خود، یا اُن کے وکیل ان کی اجازت سے اُن کی طرف سے ایجاب و قبول کریں۔ اور اگر فریقین یا ان میں سے ایک نابالغ ہو تو نابالغ کے مرد اولیاء نابالغ کی طرف سے ایجاب و قبول کریں۔

ایجاب و قبول میں سے کم از کم ایک کے الفاظ بصیغہ ماضی ادا ہوں۔ مثلاً ایک کہے کہ میں نے اپنا یا اپنی موکلہ کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا اور دوسرا فریق کہے کہ میں نے قبول کیا یا منظور کیا۔ اگر نکاح کا لفظ استعمال نہ ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس کا کوئی ہم معنی معروف لفظ استعمال کیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے کہ میں نے تمہیں اپنی زوجہ یا بیوی بنالیا یا اپنا خاوند یا شوہر بنالیا، یا کوئی اور ایسا لفظ ہو جس سے متکلم نے نکاح مراد لیا ہو اور کوئی قرینہ یہ متعین کر دے کہ یہاں نکاح ہی مراد ہے اور گواہان نکاح بھی ان الفاظ سے یہی سمجھیں کہ نکاح منعقد ہو گیا ہے۔

اگر نکاح کے ان ضروری ارکان و شرائط کی تکمیل نہ ہو تو محض ضروریات مہیا کرتے رہنا، پردہ کرنا یا نہ کرنا، خطبۂ نکاح پڑھ دینا، وعدۂ نکاح کر دینا، ان چیزوں سے نکاح منعقد نہیں ہو جاتا۔ آپ نے

منگنی کے جس ایجاب و قبول کا ذکر کیا ہے اس کی تفصیل آپ نے نہیں بتائی۔ بہرحال مذکورۂ بالا تفصیل کے مطابق جب تک نکاح کے لیے ایجاب و قبول نہ ہو، محض وعدہ اور بات چیت کو ایجاب و قبول کا نام دینے سے نکاح کا انعقاد نہیں ہو سکتا۔ صرف منگنی کے بعد طلاق دینا بھی بالکل لغو ہے۔ جب تک نکاح نہ ہو، طلاق کیسی ہوگی۔

منگنی کی رسم کے متعلق ایک اور سوال

سوال: مندرجہ ذیل مسئلہ میں آپ کی رہنمائی کا خواستگار ہوں۔ زید اور بکر نے اپنی بہن کا رشتۂ نکاح برضا و رغبت عمرو سے طے کیا۔ چنانچہ منگنی ہوئی جس میں ایجاب و قبول ہوا، مٹھائی تقسیم ہوئی، مہر کا ایک حصہ دیا گیا اور منگنی کے دیگر رسومات بھی ہوئے۔ دونوں بھائیوں میں سے اس مجلس میں صرف بکر موجود تھا۔ بعد میں دونوں بھائیوں نے کہا کہ منگنی کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تو صورتِ مسئلہ ہے۔ یہاں بلوچستان میں عرفِ عام یہ ہے کہ منگنی کے بعد کشت و خون لازمی ہے، اگر فریقین میں سے کوئی انکار کرے۔ لڑکا منگنی کے بعد لڑکی کو اپنی بیوی سمجھتا ہے اور لڑکا مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور پھر قبائلی بنیاد پر یہ فساد آگے بڑھ جاتا ہے۔ ویسے نکاح کی رات پھر خطبہ اور ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ فتویٰ دارالعلوم دیوبند میں مولانا مفتی شفیع صاحب نے منگنی کو ایک وعدہ قرار دیا ہے، بلا عذرِ شرعی انکار کرنے والے کو گنہگار کہا ہے اور اس سے زائد اس کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی ہے۔ انہوں نے ابوداؤد کی ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ اگر منگنی کو تسلیم نہ کیا جائے تو یہاں اس قبائلی علاقہ میں ایک فتنہ اور کشت و خون کا مسئلہ چل نکلتا ہے۔

جواب: آپ نے معاملے کی جو نوعیت بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی احکام سے ناواقفیت کے باعث بلوچستان میں رسم و رواج نے منگنی اور نکاح کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے بلوچستان کے اہل علم اور بااثر لوگوں کو کوشش کرنی چاہیے۔ اصلاح کی صحیح صورت یہ ہے کہ منگنی کے وقت کوئی ایجاب و قبول نہ کیا جائے اور فریقین باہم صرف یہ وعدہ کریں کہ وہ لڑکے اور لڑکی کا نکاح کریں گے۔ ایجاب و قبول اُس موقع پر ہونا چاہیئے جسے اہل بلوچستان شادی کہتے ہیں۔ اُس وقت شرعی طریقے پر باقاعدہ نکاح ہونا چاہیئے اور لڑکی کو صرف اس نکاح

کے بعد ہی لڑکے کی بیوی قرار دینا چاہیئے۔ یہ بات بلاشبہ درست ہے کہ عذر شرعی کے بغیر منگنی کو توڑ دینا جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ صرف وعدے کی خلاف ورزی ہے۔ اسے نکاح توڑ دینے کا ہم معنی نہ سمجھنا چاہیئے۔ محض منگنی ہونے سے کوئی عورت کسی مرد کی بیوی نہیں بن جاتی۔ یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ منگنی کے وقت بھی نکاح کی طرح ایجاب و قبول کیا جاتا ہے۔ اس طریقے کو اگر بند کر دیا جائے اور "شادی" (یعنی نکاح) کے وقت ہی خطبۂ نکاح اور ایجاب و قبول ہوا کرے تو لڑائی جھگڑے کی نوبت پیش نہ آئے گی۔

(بقیہ روداد ابتلاء: احمد رائف مصری)

تُل گئے تھے ——— گویا ان روز ہائے سیاہ میں زمانے کی رفتار تھم چکی تھی!!

تفتیشی بیرک کے اندر میں تین روز پڑا رہا۔ کبھی میں تعذیب کا نشانہ بنا دیا جاتا اور کبھی مجھے فراموش کر بیٹھتے۔ وہ جب مجھے بھول جاتے تو میں اس وقت بیرک کے فرش پہ ننگ دھڑنگ بیٹھا ہوتا۔ یقین جانیے، مادر زاد ننگا۔ (باقی)

تصحیح اغلاط

تفہیم القرآن جلد چہارم میں حسب ذیل تین مقامات کی تصحیح کر لی جائے:۔

——— صفحہ ۲۳۶، حاشیہ کی پہلی سطر میں تتلقاھم کے بجائے یتلقاھم لکھا جائے

——— صفحہ ۲۴۷ سطر ۳ - نہ مانیں گے کے اُوپر حاشیے کا نمبر ۵ درج کر لیا جائے۔

——— اسی صفحہ کی سطر ۶ میں سورۂ سبا کے بجائے سورۂ السجدہ لکھا جائے۔